علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۸)

یونیورسٹی کی تحریک

از:- سعید احمد اکبرآبادی

یونیورسٹی کی تحریک:-

جیساکہ شروع میں ہی عرض کیا جا چکا ہے۔ سرسید کا اصل ارادہ اور عزم یونیورسٹی قائم کرنے کا ہی تھا۔ لیکن اس کی صورت پیدا نہ ہو سکی تو فوری طور پر کالج پر قناعت کرلی، عربی کا مشہور مقولہ ہے، ما لا یدرک کلہ، لا یترک کلہ۔ لیکن یونیورسٹی کا خیال ان کے دماغ سے کبھی نہیں نکلا۔ چنانچہ ان کے جانشین نواب محسن الملک کے عہد میں بھی اس کا چرچا ہوتا رہا۔ نواب وقارالملک کے عہد میں یونیورسٹی کی باقاعدہ تحریک بڑے جوش و خروش اور ولولہ و امنگ سے شروع ہوگئی،

ہماری موجودہ نسل تو اس بات کا اندازہ کر ہی نہیں سکتی کہ اس ایک یونیورسٹی کے قیام کی خاطر ان کے بزرگوں نے کیا کیا خونِ جگر پیا اور اس راہ میں انھوں نے کیسے کیسے پاپڑ بیلے اور ہفتخوان طے کیے ہیں۔ اس داستان کا حرف حرف آج کل کے مسلمانوں کے لیے سرمایۂ عبرت و موعظت ہے۔

گاہے گاہے: باز خوان این قصۂ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

اس راہ میں سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ یونیورسٹی گورنمنٹ کی منظوری اور اس کے چارٹر کے بغیر قائم نہیں ہوسکتی تھی اور گورنمنٹ کو "مسلم یونیورسٹی" نام سے بھی وحشت ہوتی اور وہ اسے خطرناک سمجھتی تھی، لیکن علی گڑھ کالج سے وابستہ مسلمانوں کو اس پر اصرار تھا کہ یونیورسٹی ہوگی تو مسلم یونیورسٹی ہوگی۔ ورنہ یوں ہونے کو تو ملک میں اور بھی بہت سی یونیورسٹیاں ہیں، حکومت کی طرف سے بار بار انکار ہوتا تھا اور مسلمانوں کی طرف سے اصرار! آخر ایک طویل کشمکش کے بعد جب بنیادی طور پر نام کا مرحلہ طے ہوگیا۔ تو اب یونیورسٹی کے قیام کے لیے دو چیزیں ضروری تھیں۔ ایک تیس لاکھ روپیہ کے فنڈ کی فراہمی اور دوسری وہ شرائط جو اس سلسلہ میں حکومت اور مسلمانوں کے درمیان طے ہوں۔

<u>یونیورسٹی فنڈ کی فراہمی</u> | پہلا مرحلہ فنڈ کی فراہمی کا تھا۔ ظاہر ہے اس زمانہ میں مسلمانوں کی عام اقتصادی حالت کے پیش نظر اتنی بڑی رقم جو آج دو کروڑ سے کم نہیں ہے اس کا فراہم کرلینا اور وہ بھی دو تین برس کے اندر اندر! جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا، لیکن مسلمانوں نے اللہ کا نام لیکر کمر ہمت باندھ لی اور فیصلہ کرلیا کہ یہ کام بہر حال کرنا ہی ہے۔ اور وہ بھی کس طرح؟ ایک ہم ہیں کہ دریوزہ گری کو اپنا شعار بنالیا ہے۔ اور بات بات پر بھیک کا دامن پھیلاتے شرم نہیں آتی۔ اور ایک ہمارے یہ بزرگ تھے جن کے نزدیک اپنے قومی و ملی کام کے لیے غیروں سے روپیہ مانگنا سخت ننگ و عار تھا۔ چنانچہ سر آغا خاں جنھوں نے مسلم یونیورسٹی کے قیام میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ اپنی خود نوشت سوانح عمری (MEMOIRS-OF-AGAKHAN) میں لکھتے ہیں:-

"میں نے سرسید اور محسن الملک سے جوانی کے جوش میں کہا کہ ہم کیوں نہ مسٹر راک فیلر یا مسٹر کارنیگی کی طرح کے امریکی مخیر حضرات سے مل کر اس کے لیے امداد طلب کریں، لیکن میرے نئے دوست (سرسید اور محسن الملک) سن رسیدہ اور دور اندیش تھے۔ اس لیے انہوں نے کہا:- " یہ خود ہماری ذمہ داری ہے، ہندوستان کے چھ ریاست

کروڑ مسلمان اس کام کو بخوبی کر سکتے ہیں، اگر ہم بیرونی امداد حاصل کریں گے تو ہمیشہ کے لیے ہماری عزت خاک میں مل جائے گی، میں نے ان کے اس معقول خیال سے اتفاق کیا۔

سر آغا کی جدو جہد | اس عظیم فنڈ کی فراہمی کا سہرا زیادہ تر سر آغا خاں کے سر ہے۔ قدرت کو جب کوئی چیز منظور ہوتی ہے تو غیب سے اس کے اسباب بھی ایسے ہی پیدا ہو جاتے ہیں ــ سر آغا خاں ایک بیس بائیس سال کا نوجوان اسماعیلی فرقہ کا پیشوا۔ نہایت دولتمند اور بڑے عیش و عشرت اور آرام کی زندگی کا عادی! ان تمام باتوں کے باوجود ۱۸۹۶ء میں جب پہلی مرتبہ شمالی ہند کا سفر کیا اور علی گڑھ بھی آیا تو سر سید اور محسن الملک کے خلوصِ عمل اور ان کے قومی و ملی درد سے بیحد متاثر ہوا۔ اور علی گڑھ کالج سے متعلق خود بخود اس کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ اس کی توسیع و ترقی کے لیے جدو جہد کرنی چاہیئے۔ چنانچہ اس جذبہ اور تاثر کا ہی نتیجہ وہ گفتگو تھی جو ابھی اوپر گذری۔ لیکن اس وقت سر آغا خاں کو اپنے دل کی حسرت نکالنے کا موقع نہیں ملا اور بات آئی گئی ہوگئی، اس واقعہ کے ٹھیک بیس برس بعد یعنی ۱۹۱۰ء میں جب مسلم یونیورسٹی تحریک زور شور اور جوش و خروش سے شروع ہوئی تو سر آغا خاں نے اس تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی جدو جہد کے لیے اپنے آپ کو ہمہ تن وقف کر دیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے جس تگ و دو۔ اور سعی و جہد کا مظاہرہ کیا ہے ہمارے آج کل کے زعمائے قوم کو اس سے سبق لینا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں پہلا مرحلہ فنڈ کی فراہمی کا تھا۔ سر آغا خاں نے اس مرحلہ کے طے کرنے میں کیا رول ادا کیا ہے؟ اسے خود ان کی زبان سے سنیے، لکھتے ہیں۔

"بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں میں اچھی خاصی سیاسی بیداری پیدا ہو چلی تھی، لیکن میں اپنا کافی وقت، اپنی توانائی اور دلچسپی سب کچھ علی گڑھ پر مرکوز کئے ہوئے تھا، ہمارا مقصد علی گڑھ کالج کو ایک عظیم مسلم یونیورسٹی میں تبدیل کرنا تھا۔ لیکن ہماری اس تحریک کو ان طاقتور برطانوی عناصر کی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا جن کی دلیل یہ تھی کہ مسلمانوں کی الگ یونیورسٹی کا قیام مضر ہوگا۔ اس سے

فرقہ پرستی کو فروغ پانے کا موقع ملے گا۔ میں نے اپنی تمام تقریروں، مضامین
اور مالی امداد کے لیے اپیلوں میں اس خیال کی سخت تردید کی ...."

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی تحریک کو نہایت زور شور اور پوری قوت و انہماک سے شروع کرنے والے سر آغا خاں ہی تھے:

چنانچہ مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری لکھتے ہیں:-

"سنہ ۱۹۱۰ء میں ہز ہائی نس سر آغا خاں نے نواب وقار الملک کی سکریٹری شپ کے زمانہ میں یہ تجویز کیا کہ آئندہ سال ملکِ معظم ہندوستان آنے والے ہیں اس وقت تک سرمایہ فراہم کر کے اس (یونیورسٹی) کا چارٹر ملکِ معظم سے حاصل کیا جائے۔ ہز ہائی نس سر آغا خاں نے اس تحریک کو بڑے زور سے اٹھایا[1]۔

(مسلمانوں کا روشن مستقبل)

خیال کیجیے! سنہ ۱۹۱۰ء میں یہ منصوبہ بن رہا ہے اور سنہ ۱۹۱۲ء کے شروع میں دربار منعقد ہونے والا ہے۔ اور اس ایک ڈیڑھ برس کے اندر ہی اندر گورنمنٹ کے مطالبے کے مطابق تیس[30] لاکھ جمع کر لینا ہے۔ بہ ظاہر یہ بڑی انہونی سی بات تھی لیکن انسانی جہد و عمل کی تاریخ میں جنونِ شوق نے اس قسم کے ہزاروں معرکے سر کیے ہیں۔ اب پھر یہ ایک موقع تھا کہ وہ اپنی بے پناہ قوتِ عمل کا مظاہرہ کرے، سر آغا خاں نے یہ مہم کیسے سر انجام دی؟ خود ان کی زبان سے سنیے؛ لکھتے ہیں:-

"دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانے اور سرمایہ فراہم کرنے کا کام جوئے شیر لانے

---

[1] جیسا کہ سر آغا خاں نے خود لکھا ہے، ڈیوک آف کناٹ جس نے ۱۹۱۲ء میں دہلی دربار کے موقع پر لارڈ کچنر کی سرداری میں چالیس ہزار فوج سے سلامی لی تھی اور جو برطانیہ کا نمائندہ اور ملکِ معظم کا بھائی تھا وہ سر آغا خاں کا بچپن کا دوست تھا۔

سے کم نہیں تھا، میں نے پورے ہندوستان کی خاک چھانی اور عظیم مسلم لیڈروں، نوابوں اور امیروں، راجاؤں اور کسانوں کے سامنے دست طلب بڑھایا۔ خود میں نے ایک لاکھ روپیہ کا عطیہ دیا، یہ رقم اس زمانہ میں بہت بڑی تھی۔ میں ہفتوں سفر میں رہتا، اور ٹرینوں میں ہی کھاتا پیتا اور سوتا، جس جگہ بھی ٹرین رکتی میں پلیٹ فارم پر جمع ہونے والے مسلمانوں کو خطاب کرتا۔ ہر مناسب موقع پر علی گڑھ کے کاز کا تذکرہ کرتا اس پورے سفر میں میرے اعزازی سکریٹری اور دست راست مولانا شوکت علی مرحوم تھے، ان کی لگن اور جان توڑ کوششوں کے بغیر میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا"

یونیورسٹی سے سر آغا خاں کی توقعات اب ذرا یہ بھی معلوم کرتے چلئے کہ آخر وہ کونسا جذبہ اور کیا مقصد تھا جس کے باعث سر آغا خاں ایسی شخصیت نے دردر کی خاک چھانی۔ دل۔ دماغ اور جسم کی تمام توانائیاں بازی پر لگادیں، اور عیش وعشرت، راحت وسکون سب تج دیا۔

موصوف لکھتے ہیں:۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلم یونیورسٹی کے علاوہ اور کہاں یہ بات ممکن تھی کہ ہم اپنی دنیا اور اپنے زمانہ کی کل معلومات حاصل کرنے کے لیے لائبریریوں کے ساتھ ہر قسم کے سامان سے آراستہ لیبارٹریاں قائم کرتے جسے ہم اسلامی عقائد اور تہذیب کا حقیقی مرکز بناتے اور جہاں ہم اپنے مذہب کے اصولوں کی اس کی آفاقیت اور حقیقی جدیدیت، اس کی بنیادی شائستگی اور رواداری کے جذبہ پر عمل کرتے ہوئے، دیگر عقائد کا احترام کرسکتے"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"مسلمانوں کو اپنی یونیورسٹی کی ضرورت کے سلسلہ میں ایک میری دلیل یہ بھی تھی کہ یہ یونیورسٹی اسلام کے روحانی اتحاد کو فروغ دینے کا ایک مفید اور دیرپا

ذریعہ ہوگی۔ [1]

آپ سمجھے "رُوحانی اتحاد سے سر آغا خاں کی مراد کیا تھی"! اس سے مقصد یہ تھا کہ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کا ایک ایسا مرکزی ادارہ ہوگا جہاں شیعہ سنی، اسماعیلی، دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث، اہلِ قرآن غرض کہ ہر فرقہ اور ہر مکتبِ خیال کے نوجوان مسلمان یہاں ایک ساتھ تعلیم پائیں گے، ایک ساتھ رہینگے اور اُٹھیں بیٹھیں گے تو ان میں باہم میل ملاپ اور اتحاد پیدا ہوگا اور بے شبہ یہ اتحاد اسلام کی ایک بڑی طاقت ہوگا اور مسلمان بحیثیت ایک قوم کے فرقہ بندی کی اس لعنت سے نجات پا جائیں گے جس میں وہ بری طرح مبتلا ہیں اور جس نے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد: دیکھو گروہ بندی کا شکار مت ہو جانا۔ ورنہ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی (فَتَذۡهَبَ رِيحُكُمۡ) کے مطابق آج ان کو بے وقعت اور سبک بنا دیا ہے ظاہر ہے اس یونیورسٹی سے اسلام کے رُوحانی اتحاد کا یہ مقصدِ عظیم اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ یونیورسٹی صحیح معنی میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا ایک مرکزی ادارہ ہو۔ ورنہ مختلف فرقوں اور مسلکوں کے مسلمان طلباء سیکولر قسم کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ایک ساتھ تعلیم پاتے ہی ہیں۔ اس سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ سر آغا خاں نے جو بات کہی ہے وہ ایک نہایت اعلیٰ اور بلند نصب العین کی حامل ہے اور اس سے اسلام کی سربلندی سے متعلق موصوف کے جذبۂ بیقرار پر بھی روشنی پڑتی ہے،

کمیٹی تکمیل محمڈن یونیورسٹی | اس میں شک نہیں کہ سر آغا خاں نے یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے، لیکن اس سے یہ دھوکا نہ ہونا چاہیے کہ یہ سب کچھ کیا کرایا ایک شخص کا ہی تھا۔ بلکہ یہ تحریک باقاعدہ اور منظم طریقہ پر شروع ہوئی اور سر آغا خاں

---

[1] سر آغا خاں کی خود نوشت سوانح حیات اس وقت میرے پیشِ نظر نہیں ہے اوپر جو اقتباسات ہیں وہ ہمارا ڈائجسٹ کے مسلم یونیورسٹی نمبر سے لیے گئے ہیں۔

کو اس تحریک سے وابستہ کر لینا یہ بھی درحقیقت نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کا ایک بڑا کارنامہ اور ان کی مردم شناسی کی دلیل ہے، سنہ ۱۹۱۰ء کے اواخر میں جب کہ سر آغا خاں فرانس میں تھے، نواب وقار الملک نے یونیورسٹی کی تجویز و تحریک سے متعلق ان کو ایک نہایت موثر خط لکھا، سر آغا خاں اس خط سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے لکھا کہ "جی ہاں! اب وقت آگیا ہے کہ یونیورسٹی کی تحریک بڑی قوت اور زور شور سے شروع کی جائے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے تحریر کیا: میں ۲۰ دسمبر کو ہندوستان پہونچ جاؤں گا۔ اور اس تحریک کے لیے کام کروں گا۔

اس خط نے سب کے دلوں میں ایک نئی امنگ اور ولولہ پیدا کر دیا۔ چنانچہ اسی سال ماہ دسمبر ناگپور میں ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہوا تو اس میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (جن کا تفصیلی تذکرہ آئندہ اپنے موقع پر آئے گا) ایک نہایت پُر زور تقریر کے ساتھ یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی اور وہ باتفاق آرا منظور ہوگئی۔[۱]

سر آغا خاں اس اجلاس میں شرکت کی غرض سے ناگپور پہونچ گئے تھے۔ لیکن اچانک طبیعت کی ناسازی کے باعث اجلاس میں شریک نہ ہو سکے۔ لیکن کانفرنس کے نام ایک پیغام بھیجا جس کو صاحبزادہ موصوف نے پڑھ کر سنایا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا:۔

"آئندہ سال ملکِ معظم تاجپوشی کے لیے ہندوستان آنے والے ہیں۔ لہٰذا اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر مسلمانوں کو یونیورسٹی قائم کرنی چاہیے، مزید برآں انھوں نے کہا: اس مقصد کے لیے تیس لاکھ روپیہ کی ضرورت ہوگی، جن میں سے ایک لاکھ میں دوں گا۔"

اس تجویز کو عملی شکل دینے کے لیے ۱۰ جنوری سنہ ۱۹۱۱ء کو علی گڑھ میں نواب وقار الملک کی کوٹھی

---

[۱] سر آغا خاں کے بیان کے مطابق اس اجلاس کی صدارت مسٹر یوسف علی (غالباً عبد اللہ یوسف علی انگریزی کے مشہور مترجم القرآن؟) نے کی تھی اور انھوں نے یونیورسٹی سے متعلق "ہمارے مقاصد کی وضاحت بڑے اچھے انداز میں کی تھی۔"

ہز اور ہائی نس کے زیر صدارت ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں یہ طے پایا کہ ایک مستقل کمیٹی اس غرض کے لیے "کمیٹی تکمیل محمڈن یونیورسٹی" کے نام سے قائم کی جائے۔ سر آغا خاں اس کمیٹی کے صدر، متعدد با اثر اور ممتاز اصحاب نائب صدر، نواب وقار الملک سکریٹری اور نواب مزمل اللہ خاں، حاجی محمد موسیٰ خاں، مولانا شوکت علی اور شیخ محمد عبداللہ جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوئے، علاوہ ازیں وقار حیات کے مصنف کے بیان کے مطابق ملک کی تمام مشہور و سربرآوردہ انجمنوں اور تعلیم گاہوں کے عہدہ دار اور مجلس انتظامی کے ارکان، نیز تمام اسلامی اخبارات و رسائل کے اڈیٹر، کونسلوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپل بورڈوں کے ممبر اور وکلاء اور بیرسٹر تمام مسلمان زمیندار، تاجر، اور علماء و مشائخ یہ سب اس کمیٹی کے ممبر بنائے گئے۔ محمڈن کالج کے رجسٹرار خزانچی ہوئے، اور سرمایہ جمع کرنے کے لیے بنک آف بنگال کو منتخب کیا گیا، نیز ایک مینجنگ کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا، اور ساتھ ہی یہ بھی قرار پایا کہ ہر صوبہ میں ایک صوبجاتی کمیٹی مقرر کی جائے جو علی گڈھ کی مرکزی کمیٹی کے ماتحت کام کرے، علاوہ ازیں ایک چھوٹی سی کمیٹی اس مقصد کے لیے ترتیب دی گئی کہ وہ فنڈ کی فراہمی کی غرض سے ملک میں متعدد وفد بھیجے گی اور ان کو ترتیب دے گی۔

جب یہ سب کچھ ہو گیا تو مجلس کی قرارداد کے مطابق صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے اس سلسلہ میں ایک پمفلٹ شائع کیا اور نواب وقار الملک نے ملک کے نام ایک نہایت پرزور اور اثر آفرین اپیل مختلف زبانوں میں شائع کی، یہ اپیل جنوری ۱۹۱۱ء کے آخر میں شائع ہوئی تھی، خدا ساز بات تھی کہ برس کے ختم ہونے سے پہلے پہلے یعنی دس گیارہ مہینہ کی مدت میں مسلمانوں نے تیس لاکھ روپیہ کی رقم خطیر جمع کر کے رکھ دی۔ پھر کسی کہنے والے نے کیا غلط کہا ہے کہ مسلمان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک شیر ہے، جب تک پڑا سو رہا ہے ایک مکھی بھی اس کے بدن پر بیٹھ سکتی ہے لیکن جہاں بیدار ہو گیا پورے جنگل کا بادشاہ رہی ہے، [1]

---

[1] نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے ؎ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

شرائط پر حکومت اور مسلمانوں کی شدید کشمکش فنڈ جمع کرنا تو مسلمانوں کا اپنا کام تھا وہ جھٹ پٹ انھوں نے کر دکھایا، اب اس کے بعد سب سے زیادہ شدید اور صبر آزما مرحلہ گورنمنٹ اور مسلمانوں کے درمیان ان شرائط کا تصفیہ تھا جن کی بنیاد پر گورنمنٹ مسلم یونیورسٹی کے وجود کو آئینی اور قانونی شکل دینے پر رضامند ہو سکتی تھی، مسلمانوں نے کس عزم و ہمت اور جرأت و جسارت سے اس وادی ہفتخوان کو طے کیا اور وہ کس طرح اس جادۂ امید و بیم سے گذرے ہیں وہ ان کے اس عہد کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ اس لیے اسے کسی قدر تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہے: ؎ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔

کانسٹی ٹیوشن کمیٹی جب گورنمنٹ سے گفت و شنید کرنے اور مجوزہ یونیورسٹی کے لیے دستور مرتب کرنے کا معاملہ سامنے آیا تو اس مقصد کے لیے ۲۶ر فروری ۱۹۱۱ء کو ایک کمیٹی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے نام سے قائم کر دی گئی، اس کمیٹی کے صدر سر راجہ محمود آباد اور سکریٹری ڈاکٹر سید علی بلگرامی منتخب ہوئے، اس کمیٹی نے یونیورسٹی دستور کے خاص خاص عنوانات کا مسودہ ایکٹ (ACT) اور اسٹیچو (STATUTIS) کی شکل میں مرتب کر دیا تو اب ایک وفد مسٹر بٹلر جو حکومت ہند کے ممبر تعلیمات تھے، ان سے گفتگو کرنے کے لیے ترتیب دیا گیا۔ ڈاکٹر سید علی بلگرامی کا اس وقت انتقال ہو چکا تھا اور ان کی جگہ ڈاکٹر ضیاء الدین (جو بعد میں سر ہوئے) دستوری کمیٹی کے سکریٹری مقرر ہو گئے تھے۔ اس لیے اس وفد میں راجہ صاحب محمود آباد۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور نواب وقار الملک کے علاوہ ڈاکٹر ضیاء الدین بھی شامل تھے۔ یہ وفد ۱۶ مئی ۱۹۱۱ء کو شملہ میں ممبر تعلیمات مسٹر بٹلر سے ملا۔ لیکن وقار حیات کے بیان کے مطابق یہ گفتگو "صیغۂ راز" میں تھی۔ ۵۱

---

۵۱ یہ "صیغۂ راز" کا فقرہ اشتباہ انگیز ہے اس لیے اس کی وضاحت ضروری ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی نظریں اس وقت علی گڑھ پر لگی ہوئی تھیں۔ علاوہ ازیں یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مسلمانوں میں
باقی ص ۹۰ پر

اس گفتگو میں بہر حال یہ طے ہوا کہ یونیورسٹی کے دستور کا جو مسودہ اس وقت ممبر تعلیمات کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ اس پر نظر ثانی کی جائے گی۔ اور اس کے بعد ممبر تعلیمات سے پھر گفتگو ہوگی، نواب وقار الملک مسلمانوں کے ہر دلعزیز لیڈر تھے اور انہیں معلوم تھا کہ مسلمانوں کو یونیورسٹی کے معاملہ سے کس درجہ گہری اور عمیق دلچسپی ہے اور اس لئے گورنمنٹ کے ساتھ گفت و شنید کا معاملہ کس منزل میں ہے؟ اس سے باخبر رہنے کے لیے وہ کتنے بے چین اور بے قرار ہیں اس بنا پر اس سلسلہ میں جو مرحلہ بھی پیش آتا تھا نواب صاحب مسلمانوں کو بروقت اس سے مطلع کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے، چنانچہ اس موقع پر بھی انہوں نے اخبارات میں اپنا ایک بیان شائع کیا جس میں انھوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ مایوس نہ ہوں۔ گفتگو جاری ہے۔ اصل مسودہ میں کچھ رد و بدل کیا جائے گا اور اس پر ایک تاریخ معینہ پر آئندہ میٹنگ میں گفتگو ہوگی۔

مسٹر بٹلر کا ایک خط مسٹر بٹلر نے ۳۱ر جولائی کو راجہ صاحب محمود آباد (صدر مسلم یونیورسٹی دستور کمیٹی) کے نام خط لکھا جس کے اہم مشتملات امور ذیل ہیں:۔

بقیہ ص۸۵ سے

قومی و ملی افکار کے ساتھ حریت فکر اور آزادی رائے کے جذبات بھی پیدا ہو چلے تھے اور دوسری طرف حکومت سے اپنے مطالبات منوا لینا اور اپنے منشا کے مطابق مسلم یونیورسٹی کی اس سے منظوری لے لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس بنا پر بہتر اور مناسب بھی تھا کہ جب تک گفتگو کسی خاص مرحلہ تک نہ پہونچ جائے اس کو پبلک سے مخفی رکھا جائے۔ ورنہ اندیشہ تھا کہ درمیانِ گفتگو میں کسی ایک بات سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے کوئی ایجی ٹیشن شروع کر دیا تو کیا کرایا سب ملیامیٹ ہو جائے گا۔ بہر حال یہ مقصد تھا اس گفتگو کو پردۂ راز میں رکھنے کا اور جیسا کہ اس زمانے میں بعض عجلت پسند و حریت طلب حضرات نے مشہور کر دیا تھا۔ اس خفیہ گفتگو کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ یہ وفد حکومت کے ساتھ شرائط کا معاملہ بالا ہی بالا طے کر لینا چاہتا تھا۔

(۱) آپ اور آپ کے ساتھیوں نے مسلم یونیورسٹی کے مقاصد اور اس کے اغراض کے متعلق بڑی خوبی سے گذشتہ شملہ کی ملاقات میں جو کچھ مجھ سے کہا اس سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ آپ کے نزدیک یونیورسٹی کے اغراض و مقاصد وہی ہوں گے جو محمڈن کالج کے ہیں، یعنی ایک ایسی یونیورسٹی جس پر ایک طرف برٹش گورنمنٹ کو کامل اعتماد ہو اور دوسری جانب ہندوستان کے مسلمانوں کو اس پر پورا بھروسہ ہو۔

(۲) میں نے شملہ کی ملاقات میں آپ سے کہا تھا کہ یونیورسٹی کے قیام کے لئے برطانیہ کے وزیر ہند کی منظوری ضروری ہے اب میں آپ کو مسرت کے ساتھ اطلاع دیتا ہوں کہ حکومتِ ہند اور برٹش گورنمنٹ کے وزیر ہند آپ کی یونیورسٹی کا قیام منظور فرمالیں گے:۔

(۳) مگر شرط یہ ہے کہ (۱) آپ یہ دکھا سکیں کہ آپ کے پاس اس مقصد کے لیے سرمایہ بہت کافی ہے اور (۲) دوسرے یہ کہ مجوزہ یونیورسٹی کا دستور (CONSTITUTION) تمام وکمال گورنمنٹ ہند اور حضور ملکِ معظم کے وزیر ہند کے لیے قابلِ منظوری ہے۔

(۴) اگر صاحب وزیر ہند اور گورنمنٹ آف انڈیا دونوں نے یونیورسٹی کے قیام کی منظوری دیدی تو امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں بل پیش کرنا ضروری ہوگا۔ اس کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا مجوزہ آپ کی کمیٹی کے وفد کے مشورہ سے قانون کا مسودہ طے کرے گی۔

مسٹر بٹلر نے اس مکتوب میں وزیر ہند اور گورنمنٹ آف انڈیا کے اپنے مکمل اطمینان اور اعتماد کی جو بات کہی ہے اس سے مسلمانوں کو مایوسی ہوئی۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ یونیورسٹی گورنمنٹ کی مداخلت سے آزاد نہ ہوگی، اس بنا پر ایک مرتبہ نواب وقار الملک نے لکھا تھا۔ قوم کو ضرورت سے زیادہ توقع دلانا خلاف مصلحت ہے، یونیورسٹی دینا نہ دینا بالکل گورنمنٹ کے اختیار میں ہے۔ اور جب تک گورنمنٹ اس کے متعلق منظوری اور ہمارے اختیارات کی تشریح نہ ہو جائے، اس وقت تک پبلک کے سامنے کچھ کہنا بہت ہی قبل از وقت ہوگا۔

مجوزہ دستور کے خاص اہم نکات | بہر حال اب جب کہ دستور کمیٹی اور حکومت میں گفت و شنید کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا مسلمانوں کو زیادہ دنوں تک اصل صورت حال سے بے خبر رکھنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ نواب صاحب نے ایک طویل بیان شائع کیا جس میں انھوں نے تفصیل سے بتایا کہ ایک مسلم یونیورسٹی کا قیام مسلمانوں کے لیے کیوں ضروری ہے، اس یونیورسٹی کے اغراض و مقاصد کیا ہوں گے۔ اس سلسلہ میں سر سید اور ان کے ساتھیوں کے عزائم کیا تھے۔ لیکن یونیورسٹی کے قیام کی راہ میں کیا کیا مشکلات اور دشواریاں ہیں اور یونیورسٹی کمیٹی کے اصحاب کس طرح ان دشواریوں سے عہدہ برآ ہونے کی جان توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ اس طویل بیان میں جو یونیورسٹی کے لئے ایک نہایت اہم تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ نواب صاحب نے یونیورسٹی کے مجوزہ دستور کے جو اہم خد و خال سپرد قلم کئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

مذہبی تعلیم و تربیت | نواب صاحب لکھتے ہیں:

سب سے بڑا خیال جو مسلمان پبلک کو ہے (اور جو در حقیقت مسلمانوں کے لیے اور اسلامی یونیورسٹی کے لیے جان سخن ہے) وہ ہماری مذہبی تعلیم و تربیت ہے اور اس مسودہ (دستور یونیورسٹی) کے ناظرین دیکھیں گے کہ اس کی نسبت مسودہ میں ہر جگہ کافی حفاظت کی گئی ہے،

یونیورسٹی کا انتظام تمام تر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو گا | آگے چل کر دفعہ ۵ کے ماتحت رقمطراز ہیں:۔

"اعلیٰ حکمران جماعت جس طرح اب تک کالج میں صرف مسلمانوں سے مرکب ہے، اسی طرح آیندہ بھی یہ اعلیٰ حکمرانی صرف مسلمان ٹرسٹیوں کے ہاتھ میں رہنے کے واسطے مسودہ میں تجویز کی گئی ہے اور جس قدر اس وقت مسلمان ٹرسٹی کالج میں ہیں وہ سب کے سب بہ طور کورٹ آف ٹرسٹیز کے یونیورسٹی کی اعلیٰ حکمران جماعت متصور ہوں گے۔"

اس کے بعد دفعہ ۶ کے ماتحت مزید لکھتے ہیں:۔

"جس طرح اس وقت ٹرسٹیوں کا سنڈیکیٹ صرف مسلمان ٹرسٹیوں سے مرکب ہے،

اسی طرح آیندہ یونیورسٹی میں بھی وہ جماعت از نام کونسل "کورٹ آف ٹرسٹیز" کے ماتحت، بہ طور کارپرداز جماعت کے صرف ٹرسٹیز یعنی مسلمان ممبروں سے مرکب ہوگی"

وائس چانسلر کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہے | بیان کی دفعہ ۸ کے ماتحت تحریر فرماتے ہیں۔

"وائس چانسلر کی نسبت ناظرین دیکھیں گے کہ وہ کورٹ کے ممبروں میں سے کوئی شخص ہوگا اور کورٹ ہی اس کو منتخب کرے گا۔ اس لیے اس کا ہمیشہ مسلمان ہونا لازمی ہے۔

علوم اسلامیہ کی تعلیم | اس کے بعد دفعہ ۹ کے تحت میں تحریر کرتے ہیں:۔

"ہمارے قدیم مشرقی علوم کی جماعت الگ تجویز کی گئی ہے۔ جس میں لازمی طور پر ایک کافی تعداد علماء کی شریک ہوگی۔ اور اگر خدا کے فضل و کرم سے مسلمانوں کو یہ یونیورسٹی مل گئی تو لوگ دیکھینگے کہ پھر ایک دفعہ نئے سرے سے ہمارے قدیم علوم زندہ ہوتے ہیں، بڑے بڑے نامی عالم حدیث، تفسیر، فقہ، ادب، اور مختلف علوم و فنون کے یونیورسٹی کے احاطہ میں دکھائی دیں گے اور ان کے فیضِ صحبت سے ہمارے نوجوان طلبا مستفیض ہوں گے۔

ان چیزوں کا ذکر کرکے نواب صاحب فرماتے ہیں۔

"اگر یہ تجویزیں گورنمنٹ سے منظور ہو جائیں تو اس سے زیادہ معتدل کارروائی اور کوئی ہو نہیں سکتی۔"

اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یونیورسٹی کمیٹی اور عام مسلمانوں کے نزدیک یونیورسٹی کے اہم اور بنیادی مقاصد کیا تھے؟

گورنمنٹ اور مسلمانوں میں شدید کشمکش | اس کے بعد یونیورسٹی کے دستور کے معاملہ میں گورنمنٹ اور مسلمانوں کے درمیان ایک شدید کشمکش کی تاریخ شروع ہو جاتی ہے۔ بار بار ممبر تعلیمات مسٹر بٹلر سے یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے وفد کی ملاقات ہوتی ہے جس میں موصوف مجوزہ دستور کی بعض دفعات سے اختلاف کرتے ہیں اور ان کو حکومت کے لیے ناقابل قبول قرار دیتے ہوئے ان پر نظرثانی کرنے کی فرمائش کرتے ہیں ادھر بار بار کمیٹی کا جلسہ ہوتا ہے اور

بعض دفعات میں ترمیم و تنسیخ کی جاتی ہے۔ لیکن جہاں تک یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد کا ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جس طریق کار کا تعلق ہے ان میں کمیٹی کسی مصالحت کے لیے آمادہ نہیں ہوتی اور وہ ان پر سختی سے جمی ہوئی ہے، ملک میں یہ خبریں عام ہوتی ہیں تو مسلمانوں پر امید و بیم کی کشمکش کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

اختلاف کے بنیادی وجوہ اس سلسلہ میں گورنمنٹ (جس کی نمائندگی سکریٹری آف اسٹیٹ کر رہے تھے) اور یونیورسٹی کمیٹی کے درمیان اختلاف کی بنیادی وجوہ امور ذیل تھے :-

(۱) گورنمنٹ کو اس پر اصرار تھا کہ یونیورسٹی کا نام "علی گڑھ یونیورسٹی" ہوگا نہ کہ "مسلم یونیورسٹی"

(۲) گورنمنٹ کو اصرار تھا کہ یونیورسٹی کا چانسلر وائسرائے یا جلاس کونسل ہوگا۔ اور اس کے اختیارات نہایت وسیع ہوں گے،

(۳) گورنمنٹ کو سخت اصرار تھا کہ یونیورسٹی ایک مقامی اور رہائشی (RESIDENTIAL) یونیورسٹی ہوگی نہ کہ الحاقی۔

ان امور سہ گانہ پر جب اختلاف بہت شدید ہوا اور اس سلسلہ میں سکریٹری آف اسٹیٹ کی طرف سے ایک اعلان بھی ہو گیا تو مسلمانوں میں غم و غصہ اور مایوسی و ناکامی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یہاں تک کہ نواب وقار ملک نے انتہائی تاثر کے عالم میں ایک بیان پھر شائع کیا اور اس میں بعض دوسرے معاملات اور کالج کے اغراض و مقاصد پہ گفتگو کرنے کے بعد انہوں نے صاف لکھا:-

"چونکہ گورنمنٹ کی طرف سے ہم کو یونیورسٹی کے ملنے میں دقت پیش آئی ہے لہذا میری یہ رائے ہے کہ اب ہم کو اپنی تعلیم کا پروگرام بدل دینا چاہیے" یعنی اب تک جو یہ خیال تھا کہ علی گڑھ کالج ترقی کر کے "آل انڈیا مسلم یونیورسٹی"

ہوجائیگا اوراس یونیورسٹی کے ذریعہ ہم اپنی ہر قسم کی قومی تعلیمات کا انتظام کرسکیں گے،
اس کی جگہ اب ہم کو یہ کرنا چاہیئے کہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے
واسطے اپنی ایک علیحدہ جامعہ اسلامیہ خود قائم کریں " اور جو سرمایہ
مسلم یونیورسٹی کے واسطے جمع ہوا اور ہورہا ہے وہ اسی جامعہ اسلامیہ
کے سپرد کیا جائے "

نواب صاحب اس وقت بہت ضعیف وکمزور ہو جانے کے باعث خانہ نشین ہو چکے تھے اس لیے ان پر عالم یاس و حرمان کا غلبہ مستبعد نہیں ہے۔ لیکن یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے ڈٹ کر گورنمنٹ کا سامنا کیا۔ اور اپنی جد و جہد کی رفتار میں کمی کا دخل نہیں ہونے دیا۔ وہ باہم جلسے اور گورنمنٹ سے بات چیت کرتی رہی۔

بس کی گانٹھ آخر مجبور ہوکر گورنمنٹ کو اپنی ہٹ اور ضد سے باز آنا پڑا، اس نے یہ تسلیم کرلیا کہ یونیورسٹی کا نام "مسلم یونیورسٹی" ہوگا۔ اور یہ بھی مان لیا کہ یونیورسٹی کا چانسلر وائسرائے یا جلاس کونسل نہیں ہوگا۔ بلکہ یونیورسٹی کورٹ کا خود اپنا منتخب ہوگا۔ لیکن الحاق کے معاملہ میں کوئی مصالحت نہیں ہوسکی۔ گورنمنٹ اور یونیورسٹی کمیٹی دونوں اپنے اپنے موقف پر سختی سے جمے رہے، الحاقی AFFILIATING UNIVERSITY کا مطلب یہ تھا کہ مسلم یونیورسٹی ایک مقامی یونیورسٹی نہیں ہوگی بلکہ ایک ایسی یونیورسٹی ہوگی جو علی گڈھ سے باہر اسلامیہ کالجوں کو بھی اپنے نظام تعلیم و امتحان کے ساتھ وابستہ کرسکے گی کمیٹی کے ارکان کے نزدیک یونیورسٹی کا الحاقی ہونا اسی لیے ضروری تھا کہ اس راہ سے وہ ملک بھر کے تمام مسلمانوں کے لیے اپنے نصب العین کے مطابق اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کرسکتی اور یونیورسٹی کا دائرۂ عمل وسیع تر کرسکتی تھی۔ اس بنا پر کمیٹی کو اصرار تھا کہ ہم یونیورسٹی لیں گے تو الحاقی لیں گے۔ ورنہ غیر الحاقی یونیورسٹی سے بہتر تو یہی ہے کہ یونیورسٹی

پا نہیں۔

الحاق گورنمنٹ کی نظر میں | اس کے بالمقابل گورنمنٹ کو الحاق کے انکار پر جو شدید اصرار تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ملک میں ہندوؤں نے بھی بنارس میں ایک ہندو یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کے لیے گورنمنٹ سے بات چیت کا سلسلہ جاری تھا۔ مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کا بھی مطالبہ تھا کہ ان کی یونیورسٹی الحاقی ہو۔ اب گورنمنٹ نے خیال کیا کہ اگر مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی الگ الگ یونیورسٹیوں کو الحاقی تسلیم کر لیا گیا تو اس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ اور نہ ہوگا کہ پورا ملک دو کیمپوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ ایک ہندو کیمپ اور ایک مسلم کیمپ اور یہ صورت حال قومی یکجہتی اور ملک کی سالمیت کے لیے خطرناک ہوگی۔

(جاری)

درستگیٔ اغلاط

برہان ماہ جنوری ۷۳ء

(۱) صفحہ ۲۸ سطر ۴ ـ علامہ ابن حجر عسقلانی کا سن وفات ۷۵۲ھ غلط طبع ہو گیا صحیح سن وفات ۸۵۲ھ ہے

(۲) صفحہ ۲۴ سطر ۱۴ پر نکل کیا گیا غلط ہے۔ صحیح نقل کیا گیا ہے۔

قارئین۔ درست فرمالیں۔ (مینیجر)